DARYAFT: ISSN 2616-6038 (E), ISSN (P): 1814-2885
Volume 14, Issue 02, (Dec 2022): DOI # https://doi.org/10.52015/daryaft.v14i2.275

ڈاکٹر محمد نعیم

ایسوسی ایٹ پروفیسر، ادارہ زبان و ادبیات اردو پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

اردو ناول میں ثنوی فکر کا کلامیاتی تجزیہ

Dr. Muhammad Naeem
Associate Professor, Institute of Urdu Language and Literature, University of the Punjab, Lahore.

Discourse Analysis of Binary Thinking in Urdu Novel

ABSTRACT

Binary thinking is a way of understanding the world around. It is used to oversimplify the complex situations and reality. Dichotomous way of thinking usually uses an innate hierarchy of the tow objects or situations it makes binary of Urdu Novel since its inception used binary opposites to foreground the characters it likes or dislikes. In this article Critical Discourse Analysis (CDA) is used as a method to underscore the binary thinking in Urdu Novel. The article maps the social conditions of discourse and shows how these conditions were determining the discourse of Urdu Novel. Urdu Novel made many binaries of characters, social categories and race etc. Only two binaries, i.e. same gender and race are analyzed here.

Keywords: *Crtical Discourse analysis, Urdu Novel, Binary Thinking, Gender and Race..*

زبان کا عملی اور ابلاغی استعمال کلامیہ (Discourse) ہے اور اس بات کی جستجو کہ کسی کلامیے کو منطق اور ہم آہنگی کون سے عناصر فراہم کرتے ہیں کلامیاتی تجزیہ (Discourse Analysis) کہلاتی ہے۔ کلامیہ سماجی ساختوں سے متشکل ہوتا ہے اور سماجی تعلقات کو متشکل بھی کرتا ہے۔ یوں کلامیہ سماجی تشکیل بھی ہے اور سماجی تعلقات کا تشکیل کار بھی۔ اسی لیے کلامیہ سماجی استقلال اور تبدیلی ہر دو کی تعمیر میں حصہ لیتا ہے۔ یہیں سے ناول میں موجود ثنوی فکر کے کلامیاتی تجزیے کا جواز ملتا ہے۔ کسی کلامیے کی خصوصیات متعین کرنے میں سماجی

Received: 05th Aug, 2022 | Accepted: 17th Dec, 2022 | Available Online: 30th Dec, 2022
DARYAFT, Department of Urdu Language & Literature, NUML, Islamabad.
***This work** is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)*

حالات کا کردار ہوتا ہے۔ یعنی سماجی حالات کی تبدیلی، کلامیے کے خصائص کو بدل دیتی ہے۔

سوسئیر کے لسانی ماڈل کی روشنی میں زبان تجریدی ساخت (Langue) اور حقیقی اظہارات (Parole) میں منقسم ہے۔[۱] لسانی اصولوں اور عناصر کے باہمی رشتوں پہ مبنی تجریدی نظام زبان کی عملی / حقیقی اظہارات کو ممکن بناتا ہے۔ کسی زبان کے بولنے والے اس کی تجریدی ساخت سیکھتے ہیں اور حقیقی اظہارات کے ذریعے روزمرہ تقریر / تحریر تخلیق کرتے ہیں۔ سوسئیر کا لانگ کا تصور غیر سیاسی ہے۔ اس تصور میں مضمر ہے کہ کسی زبان کے بولنے والے تمام افراد لانگ پہ یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ جبکہ کلامیاتی تجزیہ دکھاتا ہے کہ لانگ پہ سب کی قدرت یکساں نہیں ہوتی۔ اسی طرح لانگ رسومیات کا مجموعہ ہے، جو سوسئیر کے لسانی ماڈل کے مطابق وحدانی ہوتی ہیں۔ جبکہ کلامیاتی تجزیے کے مطابق رسومیات بھی متنوع ہوتی ہیں اور طاقت کے کھیل کے دوران میں صورت پذیر ہوتی ہیں۔[۲]

انسانوں کے باہمی تعامل سے جنم لینے والا سماج غیر جانبدار نہیں ہوتا۔ اپنے تاریخی سفر میں سماج نے افراد کے لیے ممکنات کے غیر مساوی میدان کی صورت اختیار کر لی ہے۔ زبان کا ارتقا انسانی سماج کے پہلو بہ پہلو ہوا ہے اور کائنات کے بارے انسانی تصورات کی صورت گری بھی زبان کے اندر ہی ہوئی ہے۔ یوں کائنات بڑی حد تک زبان کے بیانات کے مجموعے کا نام قرار پاتا ہے۔[۳] کلامیے میں طاقت کی علامتی سطح پر انفرادی اختیار اور ادارہ جاتی صورتیں مستحکم ہوتی ہیں یا انھیں چنوتی دی جاتی ہے۔ طاقت غیر مساوی سماجوں میں ہمہ وقت موجود ہوتی ہے اور کئی صورتوں اور سمتوں میں اظہار کرتی ہے۔

زبان سماجی عمل (Process) ہے جسے سماجی ساختیں متعین کرتی ہیں[۴]۔ زبان کا سماج سے الگ، خود مکتفی وجود نہیں ہے۔ زبان میں قائم ہونے والا کلامیہ سماجی ساختوں سے تشکیل پاتا ہے، اسی لیے زبان کا محض لسانی اور قواعدی بنیادوں پہ کیا گیا تجزیہ ادھورا اور علمی یا کم از کم سماجی علمی اور سیاسی اعتبار سے ادھورا عمل ہے۔ زبان پہ سماج کے دیگر غیر لسانی ادارے اثر انداز ہوتے ہیں۔ زبان غیر سیاسی اور غیر سماجی مظہر نہیں ہے۔ اس کے استعمال کے ضوابط سماجی نظام سے وضع ہوتے ہیں۔ ادب کا بنیادی میڈیم زبان ہے، اس لیے ادب بھی سماجی پیداوار ہے۔ ادبی ادارے سماجی تشکیل ہیں۔

زبان بہ یک وقت ایک نظام بھی ہے اور نظام کی تشکیل کار بھی۔ یہ انسانی رشتوں کا مظہر بھی ہے اور ان کی متعینہ کار بھی۔ فرد کی تفہیمِ کائنات میں ابلاغ کا زیادہ تر انحصار زبان پر ہی ہوتا ہے، یوں زبان اس کے لیے خارج میں موجود دنیا کی تفہیم کا ذریعہ بھی ہے اور اس میں اپنے لیے امکانات کو بروئے کار لانے کا میدان بھی۔

کسی چھوٹے انسانی گروہ کی زبان ہو (جس کی مختصر ترین صورت دو افراد کے درمیان مکالمہ ہے) یا قومی یا

بین الاقوامی سطح پہ زبان کے تفاعل کا معاملہ ہو، زبان بیک وقت طاقت کے رشتوں کا اظہار اور ان کی تشکیل کار ہے۔ افراد کے باہمی تعامل کے دوران زبان کا یہ دوہرا تفاعل بروئے کار آتا ہے۔ نارمن فیئر کلو کے نزدیک کلامیاتی تجزیے کا مقصد اس دہرے تفاعل کا انتقاد ہے۔ مزید برآں یہ تجزیہ وضاحت کرتا ہے کہ سماجی حقیقت کے اندر کلامیے کی تعمیر کیسے ہوتی ہے، جس کا مقصد اس عمل کی دریافت کرنا ہے جو اس حقیقت کو بعض خاص حوالوں سے تبدیل کر سکے۔ (۵)

تنقیدی کلامیاتی تجزیے کی تین سطحیں ہوتی ہیں :

وضاحت: متن کا تجزیہ (Text Analysis)

تعبیر: تجزیہ عملیدگی (Processing Analysis)

توضیح: سماجی تجزیہ (Social Analysis)

تجزیاتی ماڈل میں سہولت کی خاطر ان تین سطحوں کو الگ الگ درج کیا گیا ہے، دراصل یہ تینوں سطحیں ایک دوسرے سے باہم پیوست اور منحصر ہیں۔

کلامیہ، زبان کا ایک مخصوص تصور ہے۔ اس تصور کی رو سے کلامیہ سماجی عملیدگی اور سماجی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ کلامیہ طاقت کا ایک کھیل ہے۔ سماجی رشتوں میں موجود طاقت کلامیے کے ذریعے لسانی صورت اختیار کرتی ہے۔ کلامیے کے اندر طاقت موجود ہوتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ کلامیے کے عقب میں بھی طاقت کارفرما ہوتی ہے۔ تنقیدی کلامیاتی تجزیہ (Critical Discourse Analysis) کلامیے کے اندر اور عقب میں کام کر رہی طاقت کا جائزہ لیتا ہے۔ یہ اس بات کی وضاحت اور تجزیہ پیش کرتا ہے کہ طاقت ور لوگ کس طرح کلامیے کی تشکیل کرتے ہیں، عمومی سماجی نظام کے ساتھ ساتھ طاقت ور کس طرح مخصوص سماجی مخاطبوں (Interview) کو کنٹرول کرتے ہیں۔ فیئر کلو کے تنقیدی کلامیاتی تجزیے میں کلامیہ سماجی جدوجہد کا ایک مظہر بھی ہے اور میدان بھی۔ فیئر کلو نے کلامیے اور متن میں امتیاز قائم کیا ہے، متن کو وہ ایک شے (Product) جبکہ کلامیے کو عملیدگی (Process) قرار دیتا ہے۔ کلامیاتی تجزیہ اسی عملیدگی کا جائزہ لیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ متون کا کلامیاتی تجزیہ پھر کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اس کی نظری بنیاد کیا ہے۔ اس کا جواب اس مفروضے میں موجود ہے کہ کلامیہ سماجی عملیدگی ہے اور متن اس کا ایک ذیلی حصہ ہے۔ ادب ایک علامتی دنیا ہے، جس میں مصنفین اپنی تحریروں کے ذریعے کلامیے میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔ خود متون کی تشکیل میں کلامیاتی عملیدگی شامل ہوتی ہے، ان کے مشتملات کو متعین کرنے اور ان مشمولات کے بارے اٹھنے والے مباحث کی حدود متعین کرنے میں بھی سماجی کلامیے کا بنیادی حصہ ہے۔ اس لیے تنقیدی کلامیاتی تجزیے کے منہاج کو متون کے جائزے میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے پیشِ نظر ادبی کلامیے کا ایک جزو ناول ہے۔ انیسویں

صدی کی نثری روایت میں ناول غالباً سب سے حاوی اور پسندیدہ ادبی صنف تھی، جسے سماجی اصلاح، صنفی امتیازات، ثقافتی بیانیوں، استعماری صورتِ حال اور ادبی حظ کی مقبول مثالوں کے لیے استعمال کیا گیا۔

کلامیے کی ایک صورت مکالمہ بھی ہے۔ مکالمے میں شامل دونوں (یا زیادہ) افراد کی گفتگو اور اس کے معنی کا تعین ان کے باہمی (مضمر یا ظاہری) تعلق کی سطح سے ہوتا ہے۔ مکالمے میں شامل دونوں افراد سماجی لحاظ سے عموماً یکساں نہیں ہوتے اور اگر ہوں بھی تو ان کی مکالمے میں پوزیشن کا مساوی ہونا، کمیاب ہے۔ مکالمے کی فضا، الفاظ کا انتخاب، لہجے کی نرمی یا سختی، مکالمے کی سمت کا تعین اور موضوعاتی دائرے کی حد بندی بڑی حد تک اس غیر مساوی پوزیشن سے طے ہوتی ہے، جو مکالمے میں شامل دونوں متکلمین کو حاصل ہوتی ہے۔ زبانی / براہِ راست مکالمے میں کم از کم یہ سہولت موجود ہوتی ہے کہ دونوں متکلمین اپنے انفرادی اختیار اور سماجی پوزیشن کے لحاظ مکالمے میں حصہ لیتے ہیں، مگر تحریر میں یہ سہولت بہت کم، بلکہ بڑی حد تک حاصل نہیں ہوتی۔ مثلاً فکشن میں مصنف ہی کرداروں کے مکالمے لکھتا ہے۔ اگرچہ یہ بات فکشن کے بہت بنیادی اصولوں میں سے ہے کہ مکالمہ کردار کی مناسبت سے لکھا جاتا ہے، اس کے باوصف مصنف کی ذاتی ترجیح اور اس کے نقطہ نظر کی پرچھائیں مکالمے کی بنت پہ اثر انداز ہوتی ہے۔ اس لیے کسی ناول کا کلامیاتی تجزیہ کرتے ہوئے یہ ضرور دیکھا جائے گا کہ یہاں مکالمے میں شامل (کم از کم دو) ذہنوں کی جگہ ایک ہی ذہن دونوں طرف کی گفتگو تحریر کر رہا ہے۔ حقیقت پسند ناول اپنے ارد گرد پھیلی زندگی کی (بزعم خود، شعوری طور پہ،) نمائندگی یا اس سے اپنے عدم اطمینان کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔ ایسے عالم میں ناول نگار مقدور بھر فکشنی رسومیات کی پابندی کرتے ہوئے کرداروں کو اپنی بات کہنے کا موقع دیتا ہے۔ ہماری نظر میں ناول نگار کی کامیابی بڑی حد تک کرداروں پر اس کی شعوری گرفت کے بالعکس متناسب ہے۔ مصنف جس قدر کرداروں کو آزادی دیتا ہے، اتنا ہی فنی طور پہ پختگی حاصل کرتا چلا جاتا ہے، کیوں کہ ناول بہر حال اس کی ذاتی زندگی کا عکس نہیں ہوتا، بلکہ متعدد زندگیوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس لیے مکالمے کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار بھی اسی امر پہ ہے کہ کردار اپنی زبان بولتا ہے یا مصنف کی بولی دہراتا ہے۔ لیکن اس اپنی بولی کی تشکیل میں کلامیاتی عملیدگی بہر حال شامل ہوتی ہے۔

مکالمہ طاقت کی عملی صورت کا مظاہرہ کرنے، اسے چنوتی دینے، اپنی شناخت وضع یا واضح کرنے، سماجی مقام کو منوانے، مستحکم کرنے یا بڑھانے، اپنی فوقی حیثیت کو منوانے اور اپنے ذاتی تصور (Self-Image) کو ٹھوس شکل عطا کرنے جیسے متنوع افعال سر انجام دیتا ہے۔ اردو ناول کے ابتدائی نمونوں میں بیانیے کی بجائے مکالمے کی فضا غالب ہے۔ اس غلبے نے بعض اوقات شارحینِ ادب کو چند تحریروں کے بارے مخمصے میں ڈال دیا کہ وہ ناول ہیں یا ڈراما۔[۲] ناول کے مکالموں کا سیاق و سباق ان کی تفہیم میں سہولت دیتا ہے۔ لیکن جہاں مکالمے کے بعد بھی مکالمہ آئے

اور محض کسی باب کے شروع یا آخر میں بیانیہ نثر، مکالماتی مباحث یا واقعات کے نتائج اور کہانی کے ممکنہ اگلے یا پچھلے پڑاؤ کی خبر دیتی ہو وہاں کلامیاتی تجزیے کے لیے خود مکالمہ، اس کے مندرجات، کرداروں کا لہجہ، لفظیات اور لسانی حربوں جیسی جزئیات پہ توجہ مرکوز کرنا ہوگی۔ یہ دیکھنا ہوگا کہ مکالمے میں شامل کرداروں کے پاس اظہار کے وسائل کی نوعیت کیا ہے؟ اس کے تجزیے سے خود مصنف کی ترجیحات کا علم بھی ہو سکے گا۔

ابتدائی اردو ناولوں میں مکالمے کی کثرت کی کئی ممکنہ وجوہ ہیں۔ اول اردو میں اشاعتی سرگرمیوں کے عروج (انیسویں صدی کا دوسرا نصف) کے زمانے میں قارئین کو متوجہ کرنا؛ دوم استعماری صورتِ حال میں متعدد نقطہ ہائے نظر کی موجودگی: استعمار کاروں کا بیانیہ، مقامی متعدد بیانیے؛ سوم ناول کی صنف کی مائع اور تشکیلی حالت، جس کے مطابق ناول رفتہ رفتہ ذہنوں اور صفحات پہ اپنی صنفی حد بندیاں قائم کر رہا تھا۔ اس زمانے میں ناول نگار اپنے تصورات (سماج کے بارے نئے تصورات) کے ذریعے سماج کو سمجھنے، اس کی تعبیر کرنے اور اسے بدلنے (اصلاح، احیا،) کے لیے اپنی سی کوششوں میں مصروف تھا۔ ایسے عالم میں مکالمہ ان سب ضرورتوں کو پورا کرنے کا ذریعہ بن رہا تھا۔ ابھی سماجی اردو نثر انسان کو اس کے ماحول کی پیداوار، یا نفسیاتی وجود سمجھنے سے دور تھی۔ اگرچہ اس زمانے کے ناول میں کردار کی پیش کش میں سماجی تفصیلات اور نفسیاتی حقائق بھی شاملِ بیانیہ ہیں، تاہم فرد کا تصور بڑی حد تک اس کے کلام سے ہی ہو رہا ہے۔ اسی لیے ناولوں پہ مکالمے کا غلبہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ناول نگار کرداروں سے مخاطب ہیں کہ "بولو، تا کہ پہچانے جاؤ۔"

کرداروں کے مکالموں کا کلامیاتی تجزیہ کرتے ہوئے، انھیں ناول نگار کی طرف سے فراہم کی جانے والی آزادی کے ساتھ ساتھ مکان (space) کو بھی ایک اہم متغیر کے طور پہ دیکھا جائے گا۔ کسی کردار کو مکالموں میں جس قدر حصہ دیا گیا ہے وہ کہانی میں اس کی اہمیت کے ساتھ ساتھ ناول کی سماجی فضا میں اس کی پوزیشن اور سماجی عمل میں اس کی اثر انگیزی کا اظہار بھی ہے۔ کردار کے خیالات، جذبات، احساسات کو مکالموں کے علاوہ بیانیے کے ذریعے بھی سامنے لایا جاتا ہے۔ کردار کے بارے بیانیے میں مصنف کا نقطہ نظر اور کردار کی طرف اس کے طرزِ فکر و احساس کا ذائقہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ مصنف کے سماجی تصورات کی تفہیم اور مختلف انسانی گروہوں کے ساتھ اس کے رشتے کی نوعیت کلامیاتی تجزیے سے سمجھی جا سکتی ہے۔

اساطیر کسی ثقافت میں پائے جانے والے لاینحل تضادات کو کسی بامعنی مظہر میں لانے کی کوشش ہوتی ہے۔ کلائیڈ لیوی سٹراس نے دکھایا ہے کہ اساطیر ایک ایسا میکانزم ہے جو سادہ اور معروف معانی کے ذریعے کسی ثقافت کے حل نہ ہونے والے تضادات سے معاملہ کرتا ہے اور سماجی فہم کی تائید کرتا اور اسے چنوتی بھی دیتا ہے۔ ان تضادات کو

عموماً متخالف جوڑوں کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس نے وضاحت کی کہ جب دو کردار کسی ثنوی ساخت میں متضاد بن کر سامنے آتے ہیں تو ان کے باہمی افتراق کی سادگی ان کے علامتی معانی کو عمومی اور قابلِ رسائی بنا دیتی ہے۔[۷]

انیسویں صدی کے برِ صغیر میں ناول کا کلامیہ جس سماجی عملیدگی کی پیداوار ہے، اس میں خواندگی، استعماری علمی وضعوں سے واقفیت، استعماری اداروں سے تعلق، بہتر سماجی مقام، وسائلِ طباعت تک رسائی اور قابلِ قبول قارئین جیسے مراحل شامل ہیں۔ بحیثیت صنف ناول کا ورود اور مقبولیت دونوں خواندہ سماجوں کی پیداوار ہیں۔ ناول میں ایجادِ بندہ کا پہلو غالب ہوتا ہے۔[۸] اردو داستان، بیانیہ پہ داستان گو کی قدرت کے ذریعے فن کاری کا نمونہ پیش کرتی ہے، لیکن اس میں پلاٹ کی خوبی یا ندرت بطورِ خاص کوئی توجہ دکھائی نہیں دیتی۔ داستان کی شعریات میں ایک پھول کے مضموں کو سو رنگ سے باندھنے کی اختراع تو ملتی ہے، لیکن فوری سماجی حالات سے کوئی پلاٹ اخذ کرنا یا اسے براہِ راست موضوع بنانا ناول کی ایجادات میں سے ہے۔ معاصر سماج سے دلچسپی کے اسباب بھی بدیسی حکومت اور دیسی آبادی کی شہری ہنرمندیوں کے لیے کی جانے والی انتظامی تبدیلیوں نے پیدا کیے تھے۔ مغرب میں ناول کا استحکام اشاعتی سرگرمیوں کے فروغ، عام تعلیم کے نتیجے میں قارئین کی بڑی تعداد اور قرات کے ذوق کا مرہونِ منت ہے۔ برعظیم میں بھی ناول کا ورود دیسی زبانوں میں اشاعتی اور تدریسی سرگرمیوں کے پہلو بہ پہلو ہوا ہے۔ ان سرگرمیوں میں استعماری حکومت کی سیاسی، انتظامی اور سماجی سرگرمیوں کا براہِ راست حصہ ہے۔

ابتدائی اردو ناول کے کلامیے میں مخالف ثنوی فکر (Binary Opposition) حاوی ہے۔ اس فکر نے اردو ناول میں کئی جوڑے تشکیل دیے ہیں، ان میں سے دو کو ہم اس جائزے میں پیش کریں گے۔

ہم صنفی ماڈل

اردو ناول میں متضاد ثنویت کی سب سے نمایاں مثال ہم صنفیت ہے۔ اس سے یہاں مراد ایسے جوڑے ہیں جن کا تعلق ایک ہی صنف (Gender) سے ہے۔ اس ثنویت کی نمایاں ترین مثالوں میں مراۃ العروس (۱۸۶۹)، مفید العورات (۱۸۷۴)، توبۃ النصوح (۱۸۷۴)، اصلاح النسا (۱۸۸۱)، چترِ بہنیلی (۱۸۸۴)، آرسی مصحف (۱۸۸۸)، فسانہ مبتلا (۱۸۸۵)، ارمان (۱۸۹۹)، مشیر نسواں (۱۹۰۶)، گودڑ کا لال (۱۹۰۷)، انوری بیگم (۱۹۰۹)، اختر النسا (۱۹۱۰)، روشنک بیگم (۱۹۲۰)، فغانِ اشرف (۱۹۲۱)، حسنِ معاشرت (۱۹۲۶) سرگزشتِ ہاجرہ (۱۹۲۸)، عاصمہ (۱۹۳۹) اور منجھلی دیدی (۱۹۴۱)، جیسے ناول شامل ہیں۔ ان سب ناولوں میں خواتین کے جوڑے پیش کیے گئے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے مردوں کو ناول لکھنے پہ فوقیت حاصل ہے۔ سماجی نظام پہ بھی انھی کا غلبہ تھا اور وسائل پہ بھی انھیں کی دسترس تھی۔ اسی لیے ناول کے ابتدائی نمونوں میں خواتین کی اصلاح کے لیے مرتب ہونے والا بیانیہ مردانہ ہے، جسے

مردانہ اداروں سے تقویت مل رہی ہے۔ خواتین کا پھوہڑ پن اور سلیقہ دونوں سماجی زندگی میں ان کے بروئے کار آنے اور مفید ہونے پہ مبنی ہے۔ سماجی زندگی کی سمت اور بہتری کا تعین بھی مرد کر رہے ہیں۔ ثنوی ماڈل میں جہاں دونوں مظاہر ایک دوسرے کی معنوی تکمیل کرتے ہیں، وہیں ایک درجہ بندی بھی قائم کرتے ہی۔ ایسی درجہ بندی میں دونوں فریقوں کا مقام پہلے سے موجود کلامیاتی نظام کو تقویت دینے کے لیے ہوتا ہے۔ مثلاً مراۃ العروس کی ثنویت (اکبری / اصغری) میں ناول نگار واضح طور پہ ایک کردار (اصغری) کو دوسرے کردار (اکبری) پہ فوقیت دیتا ہے۔ پورا ناول اس درجہ بندی کے شواہد پیش کرنے میں صرف ہوا ہے۔ اس ناول پہ لکھنے والے اصغری کے حق اور مخالفت دونوں میں دلائل جمع کر چکے ہیں[۹] اصغری کی تعریف میں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ وہ گھر داری، تعلیم و تربیت اور سلیقہ شعاری میں بے مثال ہے اور سماجی فہم و فراست اور نئے معاشی ممکنات کی سمجھ بوجھ میں مردوں کے کان کاٹتی ہے۔[۱۰] یہ بھی قابلِ غور ہے کہ اس کو پسند کرنے والے تمام کے تمام ناول کے مردانہ کردار ہیں۔[۱۱]

نئی سماجی ضرورتوں نے جو کلامیہ تشکیل دیا، اردو ناول نے اپنے آغاز سے ہی اس میں ثنوی مخالف جوڑوں کے ذریعے تصورات کو سہل بنا کر پیش کرنے کا ڈھنگ اپنایا۔ اردو کا پہلا ناول مراۃ العروس (۱۸۶۹) اس حوالے سے ایک ایسا پروٹوٹائپ ثابت ہوا جس نے اردو کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کے فکشن نگاروں کو بھی متاثر کیا۔[۱۲] اس ناول میں دو بہنوں کی مثال سے بہترین اور بدترین خاتون کی تجسیم کی گئی۔ اسی مثالیے کو بعد ازاں رشیدۃ النسا کے اصلاح النسا (۱۸۸۱) اور منشی جمیل کے آرسی مصحف (۱۸۸۸) میں بھی برتا گیا۔ منشی جمیل نے عین مین نذیر احمد کی طرح چھوٹی بہن کو عقیل اور بڑی کو کوڑھ مغز دکھایا ہے۔ منشی جمیل بڑی حد تک اپنے پیش رو اور معاصرین کے کلامیے کو لے کر چل رہے ہیں۔ اس کلامیے کی ڈور مردوں کے ہاتھ میں ہے اور خواتین کے لیے مجوزہ رول طے کر رہے ہیں۔ آیئے دونوں بہنوں کی صفات منشی جمیل کی زبانی پڑھتے ہیں:

> "چھوٹی بیگم بہ عنایت الٰہی نہایت سنجیدہ و فہمیدہ و عقیل و ذہین تھی... لیکن بڑی صاحب زادی عجب طرح کی کوڑھ مغز اور گھٹل تھیں"[۱۳]

چھوٹی کی فہمیدگی کو بڑی کا گھٹل پن قائم کر رہا ہے۔ دونوں کے مزاج کا یہ فرق ایک دوسرے کو سہارا دے رہا ہے اور دونوں کی صفات کو شدت سے نمایاں کر رہا۔ ذرا دیکھ لینا چاہیے کہ بڑی گھٹل کیوں ہے، اور اس کی کوڑھ مغزی کی کیا مثالیں پیش کی گئی ہیں جو اس کلامیے کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ بڑی کھیل کود میں مگن رہنا چاہتی ہے، جبکہ چھوٹی ان سرگرمیوں میں جو اسے سمجھائی / سکھائی جا رہی ہیں۔ بڑی اپنی ذاتی تفریح کو ترجیح دیتی ہے، من موجی ہے، جبکہ چھوٹی نے مطلوب طرزِ عمل میں اپنی شخصیت کو مکمل ڈھال لیا ہے، بڑی کی سہیلیاں ذاتی ہیں۔ سہیلیوں کے

انتخاب میں بھی کوڑھ مغزی دکھائی گئی ہے۔ یہاں کلامیہ سماجی رشتوں اور درجہ بندی کو تقویت فراہم کرتا ہے۔ دلچسپ امر یہ کہ نذیر احمد کی اکبری ہو، رشیدۃ النسا کے ناول اصلاح النسا (1881) میں بسم اللہ کی ماں ہو یا اس ناول کی بڑی بہن، تینوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ ان کا میل جول اپنے طبقے کی خواتین یا ہم رتبہ لوگوں کی بجائے ملازماؤں یا ان کی اولادوں سے ہے۔ تینوں ناولوں کا زمانی فصل دو دہائیوں پہ پھیلا ہوا ہے اور مختلف شہروں اور مصنفین کے صنفی فرق کے باوجود سماجی درجہ بندی کا نظام تینوں میں یکساں ہے۔ تینوں کے ہاں شریف زادی کے بگاڑ کے اسباب میں فرق ہے، البتہ ایک سبب، ملازماؤں سے ربط ضبط تینوں کے ہاں مشترک ہے۔

انیسویں صدی کی ثنوی فکر سے بننے والا کلامیہ نئے خیالات کی ترویج کے لیے پرانے خیالات سے اس کا تقابل کرتا ہے۔ اس مدامی تقابل کا سبب موجود سماجی نظام میں معاشی پیداواری وسائل کا بدلتا ہوا اور باہم الجھتا منظر نامہ ہے۔ جاگیر داری سماج میں زمین کی ملکیت اور نسلی درجہ بندی کا کلامیہ حاوی تھا۔ فرد بطور شخص سماج میں عمل پذیر نہیں ہوتا تھا، اور اس کی شناخت بھی انفرادی یا ذاتی کی بجائے نسلی اور اجتماعی ہوتی تھی۔ شخصی اوصاف کا بھی زیادہ تر انحصار نسلی وابستگی پہ ہوتا تھا۔ انیسویں صدی کا ناول کرداروں کی تعمیر میں اس کلامیے کو عموماً لے کر چلتا ہے۔ اس کلامیے میں ایک بنیادی تبدیلی معاشی ڈھانچے میں سرمائے کی آمد اور استعماری حکومتی سرپرستی سے ہوتی ہے۔ استعماری نظام کی ملازمتی ساختوں کے لیے مقررہ تعلیمی درجے اور مختلف ہنرمندیوں کی ضرورت نے عام تعلیم کو فروغ دیا۔ تعلیم کی طرف رغبت محض ملازمتی انعام سے پیدا نہیں ہوئی، سماجی نظام میں کلامیاتی تبدیلیوں نے بھی اس عمل کو مہمیز دی۔ ایسی ہی ایک تبدیلی نسل کے مقابلے میں علم کی آمد ہے۔ اس تبدیلیِ کلام (Discursive change) کو برپا کرنے میں سماجی مقتدر قوتوں کا بنیادی کردار ہے۔ علم سے دلچسپی اور مکتبی مواد کی عام فراہمی میں استعماری نظام کے کل پرزوں کا حصہ سب سے نمایاں ہے۔ تعلیماتِ عامہ کا ڈائرکٹر میتھیو کیمپسن ہو، یا اس کی ایما پہ لکھنے والے نظامِ تعلیم کے ملازمین ہوں، دونوں اس نئے کلامیے کی تعمیر میں حصہ لے رہے تھے۔ کلامیے کو کنٹرول کرنے کی یہ نمایاں مثال ہے۔ منشی محمد جمیل الدین نے میتھیو کیمپسن کے ارشاد پہ عورتوں کی تعلیم کے لیے آرسی مصحف تالیف کیا۔ یہ ناول متضاد ثنویت کو دو کرداروں کے ذریعے ابھارتا ہے۔ دونوں میں بنیادی فرق علم اور جہل کا ہے۔ مراۃ العروس کی طرح یہاں بھی دو بہنوں کے قصے سے مقصود تبدیلیوں کے بارے پسندیدگی کو ابھارا گیا ہے۔ دونوں بہنیں نسلاً ایک ہیں، ان کی شخصیتوں میں امتیاز قائم کرنے والا عنصر علم ہے۔ یہاں یہ امر بھی خالی از دلچسپی نہیں کہ ذہانت کا تعلق بھی علم سے قائم کیا گیا ہے اور مزاج کی درستی کو بھی علم سے ہی جوڑا گیا ہے۔ دونوں بہنوں کی طبیعتوں کو دکھانے سے پہلے منشی جمیل نے علم کی فضیلت کی تمہید باندھی کہ "علم سے بہتر اور جہل سے بدتر دنیا میں کوئی شے نہیں۔ اس طرح کلامیے میں علم و

جہل کی تکبیر (Magnification) کی گئی ہے۔ وہ دنیا میں سب سے بہتر یا کہتر، یعنی اہم ترین مظہر بن کر سامنے آتے ہیں۔ علمی تکبیر کو مزید سہارا اس "تشکیلی حقیقت" سے دیا گیا ہے کہ "تمغہ شرافت" اسی سے ملتا ہے۔ یہ تبدیلی نسلی شرافت کو علم سے منسلک کرنا ہے۔ "شریف ڈال کا ٹوٹا سید" اگر "جہلِ مطلق" ہے تو سب (مقامیوں، ہم وطنوں) کی نظروں میں "حقیر" ہو گا، جبکہ پردیس میں سب اسے "رزیل" جانیں گے۔ اور "کیسی ہی چھوٹی امت" سے تعلق رکھنے والا ہو، "اگر خواندہ ہے" تو لوگ ظاہر میں آو بھگت کریں گے، تعظیم دیں گے۔"(۱۴)

یہاں سید کو جملے کے پیش منظر (foreground) میں لایا گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ علم کے تمام تر اوصاف کے باوجود نسلی شرافت کا تصور سماجی طور پہ مرکز میں ہی ہے۔ جہاں پہلے نسل ہی سماجی شرف کے حصول کا ذریعہ تھی، اب اس میں علم کی تصدیق ملنا ضروری ہو گیا ہے۔ منشی جمیل علم کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، لیکن سماجی معیاراتِ شرف یکلخت تبدیل ہونے پہ آمادہ نہیں اور ان کا بھی مطمع نسل پہ تعلیم کو مطلق فوقیت دینا نہیں ہے، بلکہ وہ نسلی شرافت کے دوام کے لیے نئی معاشی نظام اور سماجی تبدیلیوں کی ضرورت کے پیشِ نظر علم کو لازمی قابلیت کے طور پہ پیش کر رہے ہیں۔ چھوٹی امت کو علم کی وجہ سے ملنے والی تعظیم بھی یہاں "ظاہر" تک محدود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمی برتری کے قیام کے لیے شروع ہونے والا بیانیہ علمی وصف کے حامل نسلی کمزور فرد کو پس منظر (backgrounding) کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ یہ بات اس لیے بھی کہی جا سکتی ہے کہ بیانیے کے مرکزی کرداروں کا تعلق شریف گھرانے سے ہی ہے۔

آرسی مصحف میں آگے چل کر 'علم' کے فضائل کی وضاحت آتو جی کی زبانی کی گئی ہے۔ یہاں وضاحت کے لیے اعتراض نما سوالات کا طریقہ کار استعمال کیا گیا ہے۔ جن کا آتو جی جواب دیتی ہیں۔ مکالمے کو دو طویل حصوں، سوال اور جواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سوالات میں سماج کو مرد و زن کے دو واضح منطقوں میں تقسیم کر کے پوچھا گیا ہے کہ مرد کا کام علم و فضل حاصل کرنا اور آمدن کا انتظام کرنا ہے جبکہ عورت کا کام گھر سنبھالنا ہے۔ یہاں منشی جمیل نے جاگیر داری سماج کے ان بنیادی نکات کو درج کر دیا ہے جن میں مرد و زن کے منطقے واضح اور مفترق ہیں۔ ان کے جواب میں آتو جی کی زبانی علم کے فوائد کو رکھا ہے: ان فوائد میں اولیت شرافت کو حاصل ہے۔ علم کو شرافت کا جوہر قرار دیا گیا ہے۔ دوسری بات خدا کی پہچان علم سے ہوتی ہے، اسے نا پہچاننے والا حیوان ہے۔ یہاں علم انسان اور حیوان میں امتیاز قائم کرنے کا معیار طے پا گیا ہے۔

نسلی ماڈل:

طبقاتی سماج میں تعلیمی نظام اور تعلیمی کلامیہ دونوں طبقاتی ایجنڈے کو تسلسل فراہم کرتے ہیں۔ تعلیمی

کلامیہ سماجی کنٹرول کے حامل طبقات کے مفادات کو دوام بخشنے والی آئیڈیالوجی اور اقدار کو اکثر غیر محسوس انداز میں فروغ دیتا ہے۔ [۱۵] ہمارا سروکار ناول سے ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ کیا انیسویں صدی کا شمالی ہندوستانی سماج طبقاتی تھا؟ اگر ناولانہ کلامیے کو دیکھا جائے تو ناول دولت کی تقسیم اور مالی وسائل پہ دسترس کی بنیاد پہ گروہی افتراق تو رکھتا تھا، تاہم تحریری کلامیے میں طبقاتی شعور سے زیادہ نسلی شعور کا پتہ ملتا ہے۔ اکثر لکھنے والے امارت یا غربت کی بجائے نسلی بنیادوں پر افراد کے درمیان امتیاز کرتے ہیں۔ دوسری بات انیسویں صدی کے برصغیر میں حاوی پیداواری نظام بہر کیف سرمایہ دارانہ نہیں تھا۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ سرمایہ داری کی ابتدائی صورتیں اور سماج میں سرمائے کی بنیاد پہ نئے طبقوں کا ظہور انیسویں صدی میں شروع ہو گیا تھا۔ اس دور میں ابھرنے والا سب سے اہم طبقہ تنخواہ داروں کا تھا۔ استعماری نظام کے سبب سرکاری ملازمین کی حیثیت محض ملازمین کی نہ تھی۔ انھیں عمومی سرمایہ دارانہ نظام کے ملازمت پیشہ افراد کی نسبت کچھ ایسے اختیارات بھی حاصل تھے، جن سے ان کا مقام منفرد حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ وہ عمومی سرمایہ دارانہ نظام کے ملازمت پیشہ افراد کی طرح محض مالی لحاظ سے اپنے متعلقہ طبقے کا حصہ نہ تھے۔ ایک جابرانہ نظام کا حصہ ہونے کے سبب وہ عوامی طبقات سے ممیز تھے، لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ استعماری انتظامیہ کے یورپی افسر طبقے کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ان کی سماجی حیثیت یورپی اور عوامی طبقات سے الگ تھی۔ مسلم ملازمت پیشہ افراد کی حد تک امتیاز کا ایک سبب اور بھی تھا: غیر ہندوستانی نسب۔ مسلم ملازمت پیشہ مغل دور میں مصاحبین اور امرا کی صف میں شامل تھی جو خود کو ہندوستانیوں (مسلم اور غیر مسلم ہر دو سے) سے ممیز قرار دیتی تھی۔ اسی گروہ کو استعماری نظام میں سرکاری ملازمت نے امتیاز کی ایک اور بنیاد فراہم کر دی۔ نظام کا حصہ ہونے کے باعث انھیں کلامیے کی پیداوار اور نظامِ کلامیہ دونوں پہ عوامی طبقات کی نسبت اجارہ داری حاصل ہو گئی تھی۔ اس پہلو سے دیکھیں تو سرسید کے ایسے بیانات پہ قطعاً حیرت نہیں ہوتی جس میں وہ جنگِ آزادی کی تہمت محنت کش مسلم طبقات پہ دھرتے ہیں۔ [۱۶] ان کے ایسے بیانات ملازمت پیشہ مسلم گروہ کے مفادات کو آگے بڑھانے کا ایک ذریعہ تھے۔ یوں اپنے تعلیمی اداروں میں داخلے کو اسی گروہ کے نوجوانوں تک محدود رکھنے کی سمجھ بھی آ جاتی ہے۔ اردو میں ناول لکھنے والے بیشتر افراد کا تعلق ملازمت پیشہ مسلم گروہ سے ہے، جو خود کو نسلی اعتبار سے ہندوستانیوں سے عموماً اور مقامی مسلمانوں سے خصوصاً ممتاز قرار دیتا ہے۔ ایسے افراد جب ناول لکھتے ہیں تو اپنی تحریروں سے سماجی درجہ بندی کے کلامیے کو مزید تقویت اور دوام بخشنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابتدائی اردو ناول نگاروں کے ہاں یہ کاوشیں زیادہ شدت اور کثرت سے دکھائی دیتی ہیں۔ یہیں نسلی شنویت کا کلامیہ پروان چڑھتا ہے۔ جس کے مطابق اعلیٰ انسانی اور اخلاقی قدروں کا اجتماع اعلیٰ نسل کے لوگوں میں ملتا ہے اور کمتر نسل کے افراد اقدار سے محروم ہوتے ہیں۔ ناول میں کرداروں کی صفات کا تعین بھی ان کی

نسل کی مناسبت سے کیا جاتا ہے۔ یا کرداروں کی اعلیٰ اقدار کی بنیاد ان کی نسلی برتری کو بنایا جاتا ہے۔ نسلی ماڈل ویسے تو ایک حد تک انیسویں صدی کے تقریباً ہر ناول میں مل جاتا ہے اور ثنوی اعتبار سے تقابلی فضا بھی عمومی طور پہ ناول کے کلامیے پہ چھائی ہوئی ہے۔ اردو ناول کے ابتدائی پچاس برسوں میں لکھے گئے ناولوں میں کرداروں کے خصائل کی بنیاد عام طور پہ ان کی نسلی وابستگی فراہم کرتی ہے۔ کرداروں کی اعلیٰ اخلاقی صفات بڑی حد تک ان کے خاندانی پس منظر سے ابھرتی ہیں جبکہ عمومی اخلاقی برائیاں بھی کم تر نسلی گروہ سے تعلق کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے پیش کی گئی ہیں۔[۱۷] اس پہلو کے لیے آرسی مصحف (۱۸۸۸)، ہیرے کی کنی (۱۸۹۹) اور آغا صادق کی شادی (۱۹۰۲) جیسے ناولوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔

نسل کا حیاتیاتی (Biological) تصور فطرت پسندوں (Naturalists) کے ہاں جوہریت (essentialism) کو بنیاد بناتا تھا اور انسانوں کو مختلف نسلی گروہوں میں تقسیم کرتا تھا جس کی بنیاد خون، رنگ یا کھوپڑی کی شکل یا حجم ہوتے تھے۔ جوہریت پسند آنکھوں کی شکل، جلد کی رنگت یا بالوں کی اقسام جیسی خارجی طبعی صفات کے علاوہ نفسیاتی اور مزاجی رویوں کے لحاظ سے بھی کسی نسلی قوم کے افراد میں مماثلت فرض کرتے ہیں۔ نسل کے حیاتیاتی تصور کے حوالے سے عموماً دو نقطہ نظر (approaches) رائج رہے ہیں: نوعی (typological) اور جغرافیائی۔ بیسویں صدی کے دوسرے نصف سے اب تک ان دونوں کو مختلف دلائل اور شواہد کے ذریعے بڑی حد تک رد کیا جا چکا ہے، کیوں کہ ڈارون اور بعد کی تحقیقات دکھا چکی ہیں کہ کسی نوع کو یگانہ اور زمان و مکان کے اندر کسی بھی تغیر سے عاری اور دیگر انواع سے یکسر ممیز ثابت کرنا ممکن نہیں، اسی طرح ایک جغرافیے کے اندر بھی طبعی خواص اور جنیاتی خصوصیات کے لحاظ سے منفرد اور یگانہ نسل کا سراغ نہیں ملتا، بلکہ بعض اوقات مذہبی، سماجی اور طبعی حالات کے سبب ایک ہی جغرافیے میں کئی نسلیں موجود ہوتی ہیں۔[۱۸]

اردو ناول کا عمومی بیانیہ جس کلامیے پہ بنا رکھتا ہے، وہ اپنی نہاد میں ٹھوس اور قطعیت کا حامل ہے۔ ناول میں کرداروں سے عام اور کسی حد تک لچکدار خصوصیات کی توقع تو بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں جا کر کہیں ہوتی ہے۔ ابتدائی پچاس برس کے ناول میں کرداروں کی صورت اور سیرت انتہائی نوعیت رکھتی ہے۔ کوئی خوبصورت ہے تو انتہا کا، اور بدصورت ہے تو اسی میں یکتا۔ اس بیانیے کو ایک ہی کردار میں متعدد صفات کے اجتماع سے قائم کیا جاتا ہے۔ ان صفات کا انتخاب ثقافتی معیاراتِ جمال و اخلاق سے بامعنی ہوتا ہے اور صفات عموماً رسومیاتی (conventional) ہوتی ہیں۔ ان میں انفرادی اپج یا کردار کی مناسبت سے اختراع کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار اور قارئین میں ان سماجی معیارات کے حوالے سے اتفاق پایا جاتا ہے اور دونوں رسومیاتی بیانات کو بآسانی

قبول کرتے ہیں، جس کی سادہ دلیل ان صفات کی ایک سے زائد ناولوں میں موجودگی ہے۔ خاتون کے بیان میں صورت اور سیرت دونوں کا تقاضا مردانہ معیارات رکھتا ہے۔

عبدالحلیم شرر کے ناول کرداروں کی صفات کے رسومیاتی استعمال کی عمدہ مثال ہیں۔ ان کے ناولوں سے مرتب ہونے والا بیانیہ مردانہ ہے، جو خاتون سے بہترین صورت اور اعلیٰ ترین سیرت کا متقاضی ہوتا ہے۔ ان کے ایک نسبتاً کم معروف ناول آغا صادق کی شادی (۱۹۰۲) رسومیاتی بیانات کی مثال فراہم کرتا ہے۔ شرر ناول کو عشقیہ قصہ سمجھتے تھے۔ ان کے معاشرتی ناول سماجی مسائل کی بنیاد پہ لکھے گئے۔ ان ناولوں میں ان کا بظاہر نقطہ نظر جدت پسند ہے۔ مثلاً انھوں نے پردے کی مخالفت میں ایک ناول بدرالنسا کی مصیبت تحریر کیا۔ آغا صادق کی شادی میں انھوں نے بغیر دیکھے شادی کرنے کے نقصانات کی تصویر کھینچی ہے۔ ناول کے سرورق پہ لکھا ہے کہ اس اوریجنل ناول میں ناواقفیت سے اکثر شادیوں میں پیدا ہونے والی خرابیوں کو دکھایا گیا ہے۔ آغا صادق ایک ایرانی تاجر ہے جو ہندوستان میں سکونت اختیار کیے ہوئے ہے۔ وہ ایک خوشامدی مصاحب کے ہاتھوں نکاح کے معاملے میں دھوکا کھا جاتا ہے۔ اسے ایک خوبصورت لڑکی دکھا کر ایک بدصورت لڑکی سے بیاہ دیا جاتا ہے۔ ثنویت خوبصورتی اور بدصورتی کے بیان میں ہی پیدا ہوتی ہے۔ آغا صادق خوبصورتی کا خواہشمند ہے۔ آغا پہ اپنے ساتھ ہونے والے دھوکے کی حقیقت کھلنے کے مقام پہ ہی شرر نے بدصورتی کے لسانی وسائل کو مجتمع کر دیا ہے:

> "یا تو اس حور وش، نازنین وناز آفریں لڑکی اور چاند سی دلھن کو بیاہ لائے تھے۔ یا اب جو دیکھتے ہیں تو وہی دلھن کے کپڑے پہنے ہوئے ایک ایسی بدصورت اور بدقطع لڑکی پاس بیٹھی کہ دیکھ کے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ کالی کلوٹی، موٹے موٹے ہونٹ، پھولی اور چیچک کے داغوں کی انتہا سے زیادہ کتھری ناک، بھنچے ہوئے گال اور اس پہ طرہ یہ کہ ایک آنکھ سے کانی اور دوسری آنکھ ہے بھی تو بالکل چپڑی۔ ہماہمی اور دھینگا مشتی میں اتفاقاً سر بھی کھل گیا تو معلوم ہوا کہ چندیا گنجی ہے۔"(۱۹)

لیجیے کوئی ایسا ناک نقشے کا عیب رہ تو نہیں گیا جو شرر نے بیان میں شامل نہ کیا ہو۔ بیانیے میں ثنویت کو "یا" کے ذریعے قائم کیا گیا ہے۔ خوبصورت لڑکی کی جو صفات شرر نے یہاں پیش کی ہیں، وہ ان کے دیگر معاشرتی اور تاریخی ناولوں میں بھی مل جاتی ہیں۔ مثلاً ملک العزیز ورجنا (۱۸۸۸) جیسے پہلے تاریخی ناول کو دیکھ لیجیے یا ان کے معاشرتی ناول دلچسپ کا مطالعہ کیا جائے دونوں میں خوبصورت کو "نازنین" اور "ناز آفرین" کے ذریعے ہی بیان کیا گیا ہے۔ یہاں زیادہ دلچسپ بیان بدصورتی کا ہے۔ اس بیان میں چہرے کے عیوب کو باریک بینی اور تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ شرر

کی جدت پسندی صفات کے بیان میں روایتی ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلے بد صورتی سے مرد کو خوف زدہ دکھایا ہے۔ یاد رہے جملے میں فعل کا استعمال اس طور سے کیا گیا ہے کہ کہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آغا صادق خوف زدہ ہو گیا ہے۔ فعل حال مطلق کا استعمال اسے عمومی بنا دیتا ہے، جس سے راوی اور قاری دونوں آغا صادق کے مشاہدے میں شامل ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد بد صورتی کی تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ ان میں موضوعاتی سطح (topicalization) کالی رنگت کو دی گئی ہے۔ یہ جمالیاتی معیار بیانیے کو شمالی ہندوستان کے سماجی کلامیے سے منسلک کر دیتا ہے۔ ایک ایسا سماج جو مختلف نسلوں پہ مبنی ہے اور جہاں رنگ کی بنیاد پہ نسلی افتراق قائم کیا جاتا ہے۔ یہیں شرر کی جدت، ان کے ثقافتی معیارات کی روایت پسندی سے گہنا جاتی ہے۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کا انفرادی شعور بیانیے کے ذریعے سماجی رواجوں کو تبدیل کرنے کا خواہش مند ہے تاہم ان ثقافتی شعور جس نظام کلامیہ کا پروردہ ہے، وہ اسے روایت کے استحکام کے لیے استعمال کر لیتا ہے۔ یوں بیانیہ متضاد خصوصیات کی آماج گاہ بن جاتا ہے۔ شمالی ہند میں نقوش کا تیکھا پن بھی جمالیاتی معیار ہے اور ثریا بیگم اس سے محروم ہے، اس کے ہونٹ موٹے، ناک پھولی اور چیچک زدہ ہے جبکہ وہ ایک آنکھ سے کانی، گال پچکے اور چندیا سے گنجی ہے۔ چہرے کے کسی حصے سے سلامتی کی خبر نہیں آئی۔ شرر نے عمومی انداز کے عین مطابق متعدد خامیاں ایک ہی جگہ جمع کر دی ہیں، جس نے کردار سے نفور پیدا کرنے کا سامان فراہم کیا ہے۔

بیانیے کی پیچیدگی کو ایک اور حقیقت ہوا دیتی ہے۔ ثریا بیگم کا تعلق شریف گھرانے سے ہے۔ اردو ناول کا عمومی بیانیہ کسی شریف زادی کی صورت کے بیان سے محترز رہتا ہے، بلکہ اس ناول کے علاوہ شاید ہی کہیں کم صورتی کی بھی کوئی مثال ملے۔ ایسے عالم میں اس تضاد کا کیا حل ہے؟ کیا شرر اس عمومی کلامیاتی روش سے ہٹ کر ایک شریف زادی کو بد صورت دکھا رہے ہیں، تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ بد صورتی کی انتہا دکھانے کا تعلق نسلی شرافت سے نہیں ہے، اس تضاد کی وجہ رسومیاتی ہے۔ چونکہ بیانیہ عموماً اپنی نوع میں شدت رکھتا ہے، اس لیے بد صورتی کی متعدد نشانیاں ایک جگہ جمع کر دی گئی ہیں۔ آغا صادق، ثریا بیگم کو چھوڑ دیتا ہے اور کلثوم کو اپناتا ہے، جس کا چہرہ دکھا کر اسے شادی پہ آمادہ کیا گیا تھا۔ آغا صادق کو ثریا سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ کلثوم، ایک خاتون ہی اسے اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ ثریا کی "مٹی خراب ہو گئی" ہے، کیوں کہ اب وہ گئی گزری ہو گئی ہے۔ اس کے جواب میں آغا کا جملہ ثقافتی لحاظ سے بہت بھاری ہے جو مردانہ سماجی معیارات کی سفاکیت کا برملا اظہار ہے:

> "آغا صادق: مگر وہ تو پہلے بھی کسی اچھے گھر کے قابل نہ تھی۔ اس شکل و شمائل کی عورت کو بھلا کون شخص پسند کرے گا۔"(۲۰)

سماجی میل جول خصوصاً قانونی رشتوں کا قیام سماجی درجہ بندی کا اہم پیمانہ ہے۔ اس میں عام طور پہ نسلی برابری اور مرد کی بہتر سماجی درجہ بندی کا خیال رکھا جاتا تھا۔[۲۱] لیکن یہاں شادی کے لیے ایک اضافی معیار خوبصورتی کا بھی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ بعد ازاں ثریا بیگم کی شادی اسی مصاحب سے کر دی جاتی ہے جس نے آغا کو دھوکا دیا تھا۔ شرر کا اس شادی پہ بیان ملاحظہ کیجیے: "ایک کالی کلوٹی، گنجی، بد قطع اور کانی جورو کی صورت ان [محمد حسین] کے حق میں ایک عذابِ الٰہی تھی۔"[۲۲]

اس بیان میں شرر نے ان صفات کا اعادہ کیا ہے جنھیں وہ آغا صادق پہ حقیقتِ حال کھلنے کے وقت بیان کر چکے ہیں۔ اس جملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود شرر بھی سماجی معیاراتِ جمال کے اس حد تک قائل تھے کہ ایک بد صورت شریف زادی سے شادی کو عذابِ الٰہی سمجھتے تھے۔

برِ عظیم میں مسلم سماج نسل کا ایک تصور رکھتا ہے۔ اس تصور کی بنیاد پیدائش، پیشہ یا برادری ہو سکتی ہے۔ یہ تصور دیگر مسلم سماجوں سے مختلف ہے۔ اسلام میں "کفاءۃ" کے تصور کے باوصف برِ عظیم کے قدیم اور معاصر مسلم سماج میں نسلی درجہ بندی کی موجودگی نمایاں رہی ہے اور مسلم سماج کے مختلف گروہوں کے درمیان گہرے نامساوی تعلقات کے اصول عملاً موجود رہے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں میں پائی جانے والی اشراف، اجلاف اور ارزال کی تقسیم اسلام کے ابتدائی عہد میں نہ تھی (پہلی صدی ہجری کے بعد عرب و عجم کی تقسیم اور 'خادم الاسلام' اور 'جدید الاسلام' کی تقسیم ضرور موجود رہی۔) اس تقسیم کا آغاز تیرھویں صدی عیسوی میں دہلی سلطنت کے انتظامی ڈھانچے کی مضبوطی کے ساتھ ہوا۔ اسی دوران انتظامی امور میں نو مسلموں کو ان کی سابقہ ذات کی بنیاد پہ ملازمت دی جاتی۔ اس دوران لکھے گئے بعض متون مسلمانوں میں رسول اکرم ﷺ سے نسلاً تعلق رکھنے یا نہ رکھنے کی بنیاد پہ درجہ بندی قائم کر رہے تھے۔ یہ تقسیم روزمرہ سماجی تعلقات کو ایک خاص نہج پہ کنٹرول کرنے، نسبت قائم کرنے اور اپنے متعلقہ گروہ کے مفادات کا تحفظ کرنے یا انھیں یقینی بنانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔[۲۳]

یہ اپنی جگہ اہم ہے کہ تیرھویں سے انیسویں صدی تک آتے آتے مسلمانوں میں نسلی درجہ بندی کا تصور اس قدر پختہ ہو چکا تھا کہ اس نے محاورات کی صورت اختیار کر لی تھی۔ آغا شاعر کے ناول ہیرے کی کنی کے سرورق پہ ایسا ہی ایک محاورہ درج ہے: اصل سے خطا نہیں، کم اصل سے وفا نہیں۔ اس ناول کے مندرجات اور نتائج اسی محاورے کی تفسیر ہیں۔ اس ناول میں عام سماجی تعلقات میں عموماً اور شادی بیاہ کے معاملات میں خصوصاً "نسل" کا خیال رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔

آغا شاعر نے معاصر ناول نگاری کے عمومی چلن کے مطابق ہر باب کا کوئی عنوان دیا ہے، جو اس میں مذکور واقعات کی طرف اشارہ کناں ہوتا ہے۔ پہلے باب "شوقین لڑکی" میں مصنف نے کم اصل لڑکی کی کمزوریاں دکھانے میں قریب دو صفحات سیاہ کیے ہیں۔ اُسے شادی کی جلدی ہے، آشنا سے ملتی ہے، سولہ برس کا سن، ماں باپ کو اپنے راستے کا کانٹا سمجھتی ہے اور شکایت کرنے والی ہمسائی کو بد دعائیں دیتی اور برا بھلا کہتی ہے۔ اگلے باب میں ناول کے مرکزی کردار نواب جہانگیر کو شہر کا یوسف قرار دیا گیا ہے۔ اُس زمانے کے عمومی بیانیے باپ کی وفات کے بعد نوجوان نواب یا رئیس زادوں کو مصاحبین کے ہاتھوں لٹنے کا تاسف بیان کرتے ہیں۔ اس ناول میں آغا شاعر نے لکھا کہ باپ کی رحلت کے بعد نواب زادے کو ملنے والے اختیارات نے مالی حالت کو کوئی 'گزند' نہ پہنچایا لیکن وہ "سیلف ریسپکٹ (حفظِ مراتب) "کا خیال نہ رکھ سکے، ایک مالن کی بیٹی پہ عاشق ہو گئے جس کا سن کر سارے شہر کی انگلیاں ان پر اٹھنے لگیں۔ آغا شاعر کا ناول اس سماجی درجہ بندی کو قائم رکھنا چاہتا ہے جو بیانیے سے باہر موجود ہے۔ وہ اس ناول کے ذریعے درجہ بندی کا خیال نہ رکھنے والوں کو متنبہ کر رہے ہیں کہ کیسے معاملات پیش آسکتے ہیں۔ اس بیانیے میں خاص بات انگریزی ترکیب Self Respect کا استعمال ہے۔ یہ اصطلاح جن معنوں میں آغا شاعر نے استعمال کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم از کم ان کا بیانیہ اس اصطلاح کو انفرادی اور شخصی اکرام سے مختلف سمجھتا ہے۔ ان کے نزدیک کسی بھی شخص کی عزت سماجی پہلو رکھتی ہے اور اس کا مطلب حفظِ مراتب کا لحاظ رکھنا ہے۔ نواب جہانگیر یہی غلطی کر رہا ہے کہ وہ اپنے تعلقات میں محتاط نہیں ہے۔ وہ برابر کے لوگوں سے تعلق استوار کرنے کی بجائے اپنے سے کم تر درجے کے فرد سے جذباتی تعلق قائم کر رہا ہے۔ جب وہ کیسری سے شادی کے انتظام کا حکم دیتا ہے تو بڑی بوڑھیوں کے ہاں اس پہ کافی لے دے ہوتی ہے اور اس کی ماں بھی اس حرکت کو "خلافِ شان" قرار دیتی ہے۔ وہ نواب کو سمجھاتی ہے کہ "اچھی ہڈی "اور "بری ہڈی "میں فرق ہوتا ہے۔ یہ سماجی تصور زمان و مکان سے ماورا چند بنیادی اوصاف کا انتساب کسی خاص نسلی گروہ پہ کرتا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ مجوزہ نسل سے تعلق رکھنے والے تمام افراد یکساں صفات کے حامل ہیں اور تاریخ گزرے یا مقام بدلے ان صفات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ یہ ذہن نشین رہے کہ نسلی گروہ کی کمتری کا زیادہ تر تعلق اخلاقی کہتری سے جوڑا گیا ہے۔ مغرب کے تصورِ نسل کے برعکس جہاں جلد کا رنگ کسی نسلی گروہ کے تعین کا ایک اہم ترین پیمانہ ہوتا ہے، اردو ناول میں زیادہ تر رنگ کی بجائے اخلاقی اور داخلی صفات کو بطور متعینہ استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں عموماً کہتر نسل کی خواتین پر کشش ہیں، اور یہ ذہن نشین رہے کہ ایسے معاملات میں زیادہ تر دو مختلف نسلی گروہوں کی عورتوں کے درمیان امتیاز واضح کرنا مقصود ہوتا ہے۔ ثنوی متضاد جوڑے بنا کر اپنے مبینہ تصورِ نسل کا ثبوت فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ پہلو سامنے رہے کہ ناول نگار کا اپنا گروہی (نسلی) پس منظر اس کے کلامیے کی تشکیل میں

کار فرما ہے، جس نے کلامیے کے حدود متعین کیے ہیں اور خود ناول نگار کی پوزیشن بھی واضح ہو رہی ہے۔ یہ اس امر کی طرف کی اشارہ ہے کہ کلامیے کی تشکیل میں پیدا کار کا بنیادی کردار ہے اور تحریری کلامیے کو کنٹرول کرنے اور اسے اپنی آئیڈیالوجی کے فروغ کا ذریعہ بنانے میں اس کے اختیار کو بڑی حد تک دخل ہے۔ کلامیاتی تجزیہ کرتے ہوئے کرداروں کے بارے اس نوع کے نسلی اور اخلاقی فیصلوں میں مصنف کے نسلی اور سماجی گروہی پس منظر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں ہم نے کلامیاتی تجزیے کو استعمال کرتے ہوئے اردو ناول میں موجود شوی فکر کے دو بنیادی ماڈلوں کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس جائزے سے واضح ہے کہ سماج اور اس کے مختلف مظاہر ادبی دنیا میں تشکیل پانے والے کلامیے کو متاثر کرتے ہیں۔ اس لیے ادبی تحریروں کو غیر سیاسی یا غیر سماجی سمجھنا، یا انھیں محض جمال پارے تصور کرنا یا تخلیق کار کے جمالیاتی تصورات کا تحریری اظہار سمجھنا لسانی، سماجی اور سیاسی پہلوؤں سے نظریں چرانے کے مترادف ہے۔

حوالہ جات

1. Ferdinand De Saussure, Course in General Linguistics, edited by Charles Bally and Albert Sechehaye, Translated by Wade Baskin (New York, Toronto, London: McGraw-Hill Book Company, 1966).
2. Norman Fairclough, Language and Power, 3rd ed. (New York: Routledge, 2015)

۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی، تعبیر کی شرح، اکادمی ادبیات، کراچی، ۲۰۰۵

4. Norman Fairclough, Language and Power, 51.
5. Ibid, 6.

۶۔ نواب سید محمد آزاد، نوابی دربار، مرتبہ ممتاز منگلوری مکتبہ خیابانِ ادب، لاہور، ۱۹۶۶

7. "The myth is a mechanism that deals with unresolvable contradictions by depending on simple and recognizable meanings within a culture that reinforces and challenges social understandings." David Wigston, "Narrative Analysis" in Pieter J Fourie, ed. Media Studies: Content, Audiences and Production, Vol. 2 (Lansdowne: Juta Education, 2015), 152
8. Ian P. Watt, the Rise of the Novel: Studies in Defoe, Richardson, and Fielding (London: Chatto & Windus, 1957)

۹۔ فتح محمد ملک، اندازِ نظر، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹

۱۰۔ محمد نعیم، "مراۃ العروس: نسوانی اختیار اور مردانہ اصلاح" بازیافت، شمارہ ۲۵ (۲۰۱۴): ۸۴-۱۷۷

۱۱۔ سمیرا عمر، "اردو ناول میں عورت کی سماجی پیشکش" (یونیورسٹی آف سرگودھا: مقالہ برائے پی ایچ ڈی، ۲۰۲۱)

12. A. S. Kalsi, "The Influence of Nazir Ahmad's Mirat Al-'Arus (1869) on the Development of Hindi Fiction," Annual of Urdu Studies 7, (1990): 31-44.

۱۳۔ منشی محمد جمیل الدین متخلص بہ نیر، آرسی مصحف منشی نول کشور، لکھنو، ۱۸۸۸، ۶

۱۴۔ ایضاً، ۲۔

15. Fairclough, 2015, 70

۱۶۔ سر سید احمد خان، اسبابِ بغاوتِ ہند

۱۷۔ محمد نعیم، اردو ناول کا ثقافتی مطالعہ: ۱۸۶۹ تا ۱۹۴۷، کتاب محل، لاہور، ۲۰۱۹

18. Robin O. Andreasen, "Biological Conceptions of Race" in Philosophy of Biology, eds. Mohan Matthen & Christopher Stephens (Oxford: North-Holland, 2007), 56-63.Essentialism is the view that certain categories (e.g., women, racial groups, dinosaurs, original Picasso artwork) have an underlying reality or true nature that one cannot observe directly. Furthermore, this underlying reality (or "essence") is thought to give objects their identity, and to be responsible for similarities that category members share.Susan A. Gelman, Essentialism in everyday thought, Psychological Science Agenda | May 2005, https://www.apa.org/science/about/psa/2005/05/gelman

۱۹۔ عبد الحلیم شرر، آغا صادق کی شادی، سلطان حسین تاجر کتب، بمبئی س ن، 1902، ص ۵۶۔

۲۰۔ ایضاً، ۱۰۵۔

21. Imtiaz Ahmad, Caste and Social Stratification among Muslims in India Manohar, 1978, Delhi

۲۲۔ عبد الحلیم شرر، آغا صادق کی شادی، ۱۰۷

23. Rémy DELAGE, "Muslim Castes in India" in Books & Ideas.net, Trans. By Susannah Dale https://booksandideas.net/IMG/pdf/20140929_castesmusulmans_delage.pdf Accessed on 12 December 20222

References in Roman Script:

1. Ferdinand De Saussure, Course in General Linguistics, edited by Charles Bally and Albert Sechehaye, Translated by Wade Baskin (New York, Toronto, London: McGraw-Hill Book Company, 1966).
2. Norman Fairclough, Language and Power, 3rd ed. (New York: Routledge, 2015)
3. Shams Ur Rehman Farooqi, Tabeer Ki Sharah, Acadmey Adbiyat, Karachi, 2005
4. Norman Fairclough, Language and Power, 51.
5. Ibid, 6.
6. Nawab Syed M.Azad, Nawabi Darbar, Murattaba Mumtaz manglori, Maktaba Khayaban e Adab, Lahore, 1966

7. "The myth is a mechanism that deals with unresolvable contradictions by depending on simple and recognizable meanings within a culture that reinforces and challenges social understandings." David Wigston, "Narrative Analysis" in Pieter J Fourie, ed. Media Studies: Content, Audiences and Production, Vol. 2 (Lansdowne: Juta Education, 2015), 152
8. Ian P. Watt, the Rise of the Novel: Studies in Defoe, Richardson, and Fielding (London: Chatto & Windus, 1957)
9. Fateh M Malik, Andaz e Nazar, Sang e Meel Publications, Lahore, 1999
10. Muhammad Naem, Mirat Ul Aroos: Niswani Akhtiar awr Mardana Islah" Bazyaft, Shumara 25, 2014, P 84-177
11. Sumaira Ijaz, Urdu Novel Mein Awrat ki Samaji Paishkash, University of Sargodha, PHD Thesis, 2021.
12. A. S. Kalsi, "The Influence of Nazir Ahmad's Mirat Al-'Arus (1869) on the Development of Hindi Fiction," Annual of Urdu Studies 7, (1990): 31-44.
13. Munshi Jameel Ud Din Mutakhalas ba Nayyer, Arsi Mushaf, Munshi Nawal Kishoor, 1888, P 6
14. Ibid, Page 74
15. Fairclough, 2015, 70
16. Sir Syed Ahmad Khan, Asbab Baghawat e Hind.
17. Muhammad Naem, Urdu Noval Ka Saqafti Mutala 1869-1947, Kitab Mahal Lahore, 2019.
18. Robin O. Andreasen, "Biological Conceptions of Race" in Philosophy of Biology, eds. Mohan Matthen & Christopher Stephens (Oxford: North-Holland, 2007), 56-63.Essentialism is the view that certain categories (e.g., women, racial groups, dinosaurs, original Picasso artwork) have an underlying reality or true nature that one cannot observe directly. Furthermore, this underlying reality (or "essence") is thought to give objects their identity, and to be responsible for similarities that category members share.Susan A. Gelman, Essentialism in everyday thought, Psychological Science Agenda | May 2005, https://www.apa.org/science/about/psa/2005/05/gelman
19. Abdul Haleem Sharar, Agha Sadiq ki Shadi, Sultan Hussain Tajir Kutab,Bombai, 1902, P 56
20. Ibid, Page 125
21. Imtiaz Ahmad, Caste and Social Stratification among Muslims in India (Delhi: Manohar, 1978Ibid, Page 247
22. Abdul Haleem Sharar, Agha Sadiq ki Shadi, P 107
23. Rémy DELAGE, "Muslim Castes in India" in Books & Ideas.net, Trans. By Susannah Dale https://booksandideas.net/IMG/pdf/20140929_castesmusulmans_delage.pdf Accessed on 12 December 2022